تحقیقی گفتگو: ڈاکٹر تقی عابدی

خدائے سخن میر تقی میرؔ کے مرثیے

کہتے ہیں کہ ہر بڑے منہ کی چھوٹی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔ دنیائے ادب میں عظیم شاعروں کا ہر شعر اپنا آپ مقام رکھتا ہے۔ اگر اردو شاعری کے خدائے سخن میر تقی میرؔ ہیں تو پھر ان کا کلام صحیفۂ سخن اور ان کے کلام کا ہر ہر شعر آیت سخن کی مصداق ہونا چاہیے لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کی دنیائے سخن میں بقول میر انیسؔ ۔

عالم ہے مکدّر کوئی دل صاف نہیں ہے
سب کچھ ہے اس دنیا میں بس انصاف نہیں ہے

میرؔ کی تصنیفات کی تعداد زیادہ ہے جس کا ذکر ہماری گفتگو کا موضوع نہیں۔ آج میرؔ کے انتقال کے دو سو برس بعد بھی میر شناسی کے بہت سے پہلو روشن نہ ہو سکے اگر چہ اردو کے تقریباً ہر مشہور و معروف نقّاد نے میرؔ کی عظمت کا اقرار کیا ہے، اگر کسی تذکرہ نگار جیسے مصطفیٰ خان شیفتہؔ نے گلشن بے خار میں میرؔ کی شاعری میں رطب و یابس کی طرف اشارہ کیا ہے تو اس کی توضیح بھی ۔ ''در ید بیضا ہمہ انگشت ہا یکدست نیست''، کہہ کر کر دی ہے۔

میرؔ صاحب نے کم بیش ہر صنف سخن میں اپنی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اگر چہ اردو شاعری میں غزل کا دوسرا نام میر تقی میرؔ ہے لیکن اردو شاعری کی وہ اصناف جو بگڑی اور معمولی تھیں ان کو بھی میرؔ صاحب نے کمال کے منصب پر بٹھا دیا۔ غزل ہو کہ مثنوی، قطعہ ہو کہ رباعی، قصیدہ ہو کہ مرثیہ ہر شعر حسن یوسف ہے جس کو بازار مصر میں پیش ہونا چاہیے۔ ہر لفظ میرؔ کے صحیفہ کا سند ہے جیسا کہ خود میرؔ نے کہا ہے ۔

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اوّل تو میں سند ہوں پھر یہ مری زبان ہے

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

میرؔ عشق اور غمِ دولت کے شاعر ہیں ۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
رنج و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

اگر چہ اوپر کے شعر میں مرثیہ لغوی معنی میں استعمال ہوا لیکن ہماری گفتگو درحقیقت اصطلاحی معنی مرثیہ یعنی وہ نظم جو شھدائے

کربلا سے متعلق ہے ہوگی۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ میر صاحب کے مرثیوں کا مجموعہ پہلی بار آج سے صرف ترسٹھ سال قبل ۱۹۵۰ء میں لکھنو سے شائع ہوا جس کو پروفیسر مسیح الزماں صاحب نے مرتب کیا تھا۔

میر صاحب کے مرثیوں سے نو مرثیوں کے صرف مطلع کے بندوں کو پہلی بار ۱۹۲۸ء میں رسالہ نیرنگ رام پور نے میر نمبر میں شائع کیا پھر انجمن ترقی اردو نے چھ مرثیے اور ایک سلام کو اردو اپریل ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ اگر چہ کلیات میر کے قدیم نسخوں میں ان کے مرثیے اور سلام نظر آتے ہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق آج بھی میر صاحب کے بعض مرثیے اور سلام غیر مطبوعہ قدیم قلمی نسخوں میں موجود ہیں جس کی نشان دہی محقق رثائی ادب پروفیسر اکبر حیدری نے ''اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء'' میں کی ہے۔ انشاءاللہ راقم بہت جلد خدائے سخن میر کے تمام رثائی کلام کو شائع کرنے کی توفیق حاصل کرے گا۔

میر کے مطبوعہ مرثیوں، سلاموں اور نوحوں کی تعداد کچھ اس طرح ہے۔ (۱) کل مراثی '۳۱' جس میں '۲۷' مرثیے مربع شکل میں، دو مرثیے مسدس کی شکل اور ایک ایک مرثیہ ترکیب بند اور ترجیع بند کی شکل میں ہے۔ (۲) کل سلام پانچ عدد۔ (۳) نوحوں کی تعداد تین ہے۔ مطبوعہ مرثیوں، سلاموں اور نوحوں کے اشعار کی تعداد '۱۶۸۱' ہے۔

میر کے مرثیوں پر بہت کم لکھا گیا اگر ان دوسو سال کے تشریحی، تنقیدی اور حقیقی اوراق کو جمع بھی کریں تو مشکل سے ان کی تعداد بیس (۲۰) صفحات سے زیادہ نہ ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ ناقدین ادب نے میر کے مرثیوں پر توجہ نہ کی ورنہ وہ یہ نہیں کہتے کہ ''میر خود روتے ہیں دوسروں کو رلا نہیں سکتے ان کے یہاں مرثیہ ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔'' یہ ضروری نہیں کہ میر کے مرثیوں کا ان کی غزلوں سے تقابل کیا جائے کیوں کہ یہ تقابل ممکن نہیں البتہ میر کا انداز جس کا اعترف شیخ ذوق نے کیا۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یا جس کی حسرت، حسرت موہانی نے کی ع ''میر کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں'' میر کا وہ انداز جس میں بقول مصنف ''طبقات الشعراء'' خوش طبعی، خوش فکری، محاورہ بندی، جدت نگاری، رنگینی مضمون، تلاش الفاظ چرب وشیرین اور سادہ گوئی شامل ہے، تمام تر ان کے مرثیوں میں موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مرثیے کی تقدیس اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ رنگ حسن، لفظوں کے پیرہن سے نظر آئے اور عطار کے لونڈے سے دوا لی جائے بلکہ یہاں پڑھنے والے کو اخلاق اور کردار کے اعلی اقدار سے ایسا ہی ہم کنار کردیا جاتا ہے وہ بھی نور کے راستے کا درخشاں پیکر بن جاتا ہے۔

''نقد میر'' میں ڈاکٹر عبداللہ نے جو انداز میر کی پانچ عام خصوصیات بتائی ہیں وہ تمام مراثی میر میں ہمیں نظر آتی ہیں یعنی میر کے مرثیوں میں:

اول۔ خلوص اور صداقت ہے جس کی وجہ سے مضامین میں قطعیت پیدا ہوئی ہے۔

دوم۔ منظرکشی اور جذبات کی مصوری کے کامیاب حصے موجود ہیں۔

سوم۔ مرثیوں کے مکالمے اور بول چال کے انداز میں لہجہ عام موجود ہے۔ یہاں ہم حسب مراتب بھی دیکھ سکتے ہیں۔

چہارم۔ میؔر کے مرثیوں میں طرز ادائیگی استدلالی انداز سے زیادہ بیانیہ اور خطابیہ ہے۔ جو میؔر کے انداز کی شناخت ہے۔
پنجم۔ محاسن زبان جو بقول میؔر ان کے کلام کی شناخت بھی ہے ۔

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہُر کی طرف

اردو زبان کی تاریخ میں جا بجا جھول نظر آتے ہی شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جن علمائے ادب نے تاریخ مرتب کی انھوں نے شعری حوالوں کو بخصوص وہ تاریخی اور سماجی حوالے جو مرثیوں میں نظم ہوئے تھے ان پر چنداں توجّہ نہ کی ورنہ اردو کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سماج کی تصویر کے نقش بھی مستند طور پر ثبت ہو سکتے تھے۔

اٹھارہویں صدی میں دہلی کی عزاداری کا آنکھوں دیکھا حال میؔر کے مرثیے میں دیکھیے۔

گھر سیاہ اپنے کریں گے اس عزا میں سب امیر
اس کے ماتم میں بہت سے لوگ ہوئیں گے فقیر
سینہ کوبی کرتے کوچوں میں پھریں گے خُرد و پیر
عورتیں بے تاب نکلیں گی گھروں سے موفشاں
نعل سینوں پر جڑیں گے اور سر پھوڑیں گے لوگ
کھینچیں گے کتنے الف داغ اور کتنے لیں گے جوگ
اچرا اس ماتم سرا میں رکھیں گے اس شۂ کا سوگ
حلقہ حلقہ لوگ ہوں گے نوحہ ہوگا درمیاں

اس زمانے میں دہلی میں لوگ محرم میں نیلے رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔

گریہ وزاری پہ رکھیں گے خردمنداں اساس
جامۂ آبی مقرر ہوگا ہر اک کا لباس

ایک اور مرثیہ میں محرم کے جلوس اور مجلسوں میں ماتم منانے کے طریقوں کا یوں بیان کرتے ہیں ۔

الف داغ کھینچے کہیں جائیں گے
کہیں نعل سینوں پر جڑوائیں گے
دُہل کی صدا جھانجھی کا وہ شور
قیامت سی رکھیں گے ہر چار اُور
جواں چھاتیاں اپنی کوٹیں گے زور

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا مرثیہ فارسی زبان میں صفوی حکومت کے ملک الشعراء ملا محتشم کاشی کا ہے جو ترکیب بند ہیّت میں لکھا گیا ہے اور بارہ (۱۲) بند پر مشتمل ہے جس کا مطلع ہے۔ ۔

باز این چہ شورش است کہ در خلقِ عالم است
باز این چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است

میر تقی میؔر نے بھی اس کاشی کے مرثیہ سے متاثر ہو کر ترکیب بند ہیّت ہی میں بارہ بند کا شاہکار مرثیہ لکھا۔ اگر چہ اس مرثیہ کا لہجہ بھی محتشم کاشی کے لہجہ سے میل کھاتا ہے لیکن یہ میؔر صاحب کی قادر الکلامی اور معجز بیانی ہے کہ تمام مرثیے کے مضامین کاشی کے مرثیے

کے مضامین سے جدا ہیں اور میرؔ صاحب کے مرثیہ میں محتشم کاشی کے مرثیے سے زیادہ درد ہے۔

میرؔ صاحب کا مطلع اور مقطع محتشم کاشی کے مرثیہ کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ مرثیے کے کچھ شعر یہ ہیں۔

پھر کیا یہ دھوم ہے کہ جہاں ہے سیہ تمام
پھر کیا یہ ماجرا ہے کہ ہے صبح جیسے شام

پھر کیا ہے یہ غبار کے اُٹھتے ہیں دل سے جوش
پھر کیا یہ مُج ہلہ ہے کہ حیران ہیں خاص و عام

کس کا کیا ہے تازہ حوادث نے ایسا خون
ہر صبح آفتاب پئے ہے لہو کا جام

زھرؑا کے دل کا لختِ محمدؐ کا نورِ عین
اسلامیوں کے ظلم سے مارا گیا حسینؑ

محتشم کا مقطع ہے۔

خاموش محتشم کہ دلِ سنگ آب شد
بنیادِ صبر و خانہ طاقت خراب شد

میرؔ صاحب فرماتے ہیں۔

خاموش میرؔ شمع رسالتؐ کی بجھ گئی
بادِ شمالِ ظلم نے کی، صبح ترک تاز

خاموش میرؔ بس یہ جگر سوز غم نہ کہہ
گریہ کے ہم تو لختِ جگر کرتے ہیں نیاز

خاموش میرؔ بولنے کی جا نہیں ہے یہ
ویرانہ میں پڑا رہا کہتا ہے گنج راز

خاموش میرؔ کرتی ہے دل چاک تیری بات
صلوات بر حسینؑ کہ ہوگئی تری نجات

میر انیس نے کہا۔

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووئے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووئے

میرؔ کہتے ہیں۔

کہوں یہ واقعہ آگے تو غم ہو
دلوں کو میرؔ صد گونہ الم ہو

قصہ کوتاہ میرؔ کہاں تک آلِ عباؑ کے دکھ سینے
روئیے کُڑھیے ماتم کریئے، کوٹیے چھاتی سر دُھنیے
جیسے کباب بروئے آتش جلیئے شام و سحر بھنیے
چپ رہ ظالم خوب نہیں اب آگے بات بڑھائی ہوئی

یہ کہہ کے گئے آگے روتے ہوئے غم دیدہ
اب تو بھی قلم رکھ دے اے میرؔ ستم دیدہ

بس گریہ سے خامے کے کاغذ تو ہے نم دیدہ

دیوانی کر اس جا پر یہاں عقل ہے دیوانی

میؔر کے مرثیوں کے بارے میں یہ بات بھی نہ جانے کیوں مشہور ہوگئی ہے کہ یہ مراثی ان کی آخری عمر کی تصانیف ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مرثیے میؔر صاحب نے عالمِ پیری میں کہے ہیں جیسا کہ ان مرثیوں سے ظاہر ہے ؎

مدت تک کی ہرزہ سرائی

شہرت ہوئی پر ذلت اٹھائی

بس میؔر کب تک پیری بھی آئی

اب مرثیہ ہی اکثر کہا کر

ایک دوسرے مرثیہ کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

ہر چند شاعری میں نہیں ہے تیری نظیر

اس فن کے پہلوانوں نے مانا تجھی کو میر

پر ان دنوں ہوا ہے بہت تو ضعیف و پیر

کہنے لگا جو مرثیہ اکثر بجا کیا

میؔر کے چھ دیوان اس بات کی مستند سند ہیں کہ میؔر ہی کے ابتدائی اور آخری کلام میں زبان اور طرز بیان میں فرق آچکا تھا جس سے شعر و زبان کے ارتقا اور تبدیلی کا ثبوت ملتا ہے چنان چہ جب ہم نے مراثی میؔر کا بغور مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ بعض مراثی ان کے ابتدائی کلام معلوم ہوتے ہیں اگر چہ اکثر مرثیوں اور سلاموں سے ان کی پختہ کلامی اور کہنہ مشقی ظاہر ہے۔بعض مرثیوں میں وہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں جنھیں میؔر صاحب نے بعد میں ترک کر دیا تھا۔

میؔر کے مرثیوں میں برصغیر کے سماج کی جھلکیں نظر آتی ہیں۔ میر صاحب نے حضرت قاسمؑ کی شادی کی عکاسی کرتے ہوئے ہندوستانی رسوم برات، سہرا، حنا بندی، مصحف و آرسی، ساچق، نیگ وغیرہ کو بڑے موثر طریقہ پر نظم کیا ہے۔ اگر میؔر صاحب اپنے مرثیوں میں یہ ہندوستانی سماجی قدروں کو پیش نہ کرتے تو مرثیوں میں وہ گداز و سوز باقی نہ رہتا اور مرثیہ کسی پردیس کی حکایت بن کر رہ جاتا اس میں تقلیدی اور تاثیری گنجائش نہ رہتی اسی کامیاب تجربہ کی بنیاد پر فلک مرثیہ کے آفتاب و مہتاب یعنی میر انیس اور مرزا دبیؔر نے مرثیہ کا تاج محل تعمیر کیا۔

حضرت قاسمؑ جو کربلا کے دولھا ہیں سراپا کے دو شعر دیکھئے

دولھا اگر تھا ظاہر نو یلا

لیکن نہایت بے کس اکیلا

دل کے الم سے، رخ زرد چوں زر

آنسو کا سہرا چہرے کے اوپر

میؔر کے مرثیوں میں جا بجا قادرالکلامی اورشوکت الفاظ کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔مربع مرثیوں میں جو میؔر کے مرثیہ گوئی کارواج تھاتراکیب اورقوافی ملاحظہ کیجئے۔

محمدؐ جسکا نانا اسکو بیکس کرکے سب ماریں
پدر ساقی کوثر جسکا اسکو تشنہ لب ماریں
سبب جو بخششِ عالم کا اس کو بے سبب ماریں
حرم کا جو ہے عزت دار سو محتاجِ چادر ہے

شہِ ہردوجہاں زیرِ نگیں، معروف اور نامی
امام عارف و عامی نبیؐ کے دین کا حامی
سراس صبح سعادت کا سناں پر لے چلے شامی
کہاں حیدر کہ جو دیکھے وہی یہ ناز پرور ہے

عجائب درہمی آئی ہے اس جمع پریشاں میں
قیامت کا ساہنگامہ ہے برپا اک بیاباں میں
تری اس چین سے کیونکہ لگی ہے آنکھ میدان میں
بلا ہے، فتنہ ہے، آشوب ہے اک شور ہے شر ہے

جگر ٹکڑے ہوا ہے کب تلک یہ سختیاں دیکھے
نکلتی آنکھ سے یاقوت کی سی تختیاں دیکھے
لتس اوپر شام کے لوگوں کی یہ بدبختیاں دیکھے
بلالے پاس ہمکو جلد اپنے ہی تو بہتر ہے

نہیں ان کلفتوں کی تاب لائی جاتی اب ہم سے
لپٹ سی ہونٹ کو لگنے لگی ہے گرمی دم سے
دردنی جل گئی شاید ہماری آتشِ غم سے
ٹپکتا آنکھ سے آنسو جو ہے گویا کہ اخگر ہے

جو کچھ اے میرؔ آگے چل کر پیش آیا انھیں مت کہہ
کہاں تک نوحہ و زاری کرے گا ہر گہہ و بیگہ
یہیں سے رنگ تیرے دل کا پیدا ہے بس اب چپ رہ
کہ جو آنسو گرے ہے آنکھ سے یاقوتِ احمر ہے